# زندہ سوالات


السیّد علی نقی النقوی

صدر شعبۂ شیعہ دینیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سلسلۂ منشورات دینیات فیکلٹی

# تیرہ سوالات

از قلم

سید العلماء، پروفیسر مولانا السید علی نقی النقوی (مجتہد)
صدر شعبۂ دینیات شیعہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

# فہرست

# اسلام و ملیت ایران

یہ مقالہ ۲۴ ذی الحجہ سنہ ۱۳۸۸ھ ۱۴ مارچ سنہ ۱۹۶۹ء بروز جمعہ
۴ بجے سہ پہر کے وقت مسلم یونیورسٹی اسٹوڈینس یونین کے
کُل ہند سیمینار میں پڑھا گیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی سید المرسلین
وآلہ الطاہرین

---

میرا جہاں تک مطالعہ ہے " وحدتِ ادیان " کی لفظ تیرھویں صدی کے بعد بعض مذاہب مستحدثہ کے لٹریچر سے لوگوں کے گوش گزار ہوئی اور اب اکثر سیاسی طور پر اہل مذاہب میں یک جہتی کی تبلیغ یا باہمی نفرت کے کم کرنے کے نیک مقصد سے بہ حمایۃ تقریروں یا تحریروں میں آتا ہے کہ حقیقت میں سب مذہب ایک ہیں اور غالباً اسی نیک مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اس سیمینار میں زیرِ بحث آنے والے عناوین کی فہرست میں ایک عنوان یہ قرار دیا گیا جسے واقع شدہ یا ممکنہ غلط فہمیوں کو دور کرنے اور صحیح پہلو کو سامنے لانے کی غرض سے میں نے اپنے ذمہ لیا اور اسی پر اس وقت تبصرہ کرنا ہے۔

---

" ادیان " کی لفظ جو " دین " کی جمع ہے خود اپنی ساخت کے لحاظ سے اُس کثرت کا پتہ دیتی ہے جو " وحدت " کی ضد ہے اور یہ کثرت باہمی " اختلاف " کے ساتھ لازم و ملزوم کا تعلق رکھتی ہے مطلب یہ ہے کہ اگر سب باتیں ایک ہی ہوں تو " دین " کے بجائے " ادیان " ہو کیوں کر سکتے ہیں ۔ لہذا سب نہیں تو کچھ باتیں ضرور ایسی ہیں جو الگ الگ ہیں تب ہی وہ " ادیان " سمجھے اور کہے جاسکتے ہیں ۔ اب جبکہ ادیان کی لفظ ساتھ

اختلافات کا تصور ناگزیر ہے تو کیا عقلی طور پر یہ ادیان سب مطابق حقیقت ہو سکتے ہیں؟
یہاں پر ایک چلا ہوا جملہ یہ ہے کہ راستے الگ الگ ہیں، منزل سب کی ایک ہے۔ مگر معلوم ہونا چاہیے کہ یہ بات طریق عبادت کے اختلاف میں تو عقلی طور پر صحت کا امکان رکھتی ہے چنانچہ یہ اختلاف عمل ایک ہی وقت میں کسی ایک دین کے پیروؤں میں بھی ہو سکتا ہے مثلاً کئی مسلمان ہیں اور ایک ہی وقت میں ان میں سے ایک خیرات دے رہا ہو، ایک کسی ڈوبتے کو بچا رہا ہو اور ایک کسی گرتے کو سنبھال رہا ہو۔ ان کا عمل مختلف ہے مگر صحیح محل پر ہونے کی صورت میں سب کے ذریعہ سے رضائے الٰہی کا حصول ہو سکتا ہے جسے ایک مسلمان کی منزل مقصد سمجھا جا سکتا ہو۔ یہ اختلاف برا نہیں ہے بلکہ کبھی تقسیم عمل کے اصول پر یہ اختلاف ضروری ہو جاتا ہے مگر "ادیان" کا یہ عملی تو شریعت یعنی قانون عمل سے تعلق رکھتا ہے۔ اصل ادیان کا اختلاف تو اعتقادات کی منزل میں ہوتا ہے جو نظری اختلاف ہے۔ نظریات کے اختلاف میں یہ بات کسی طرح ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ وہاں اگر راستے الگ الگ ہیں تو وہ کسی بھی منزل پر پہنچ کر ایک نہیں ہو سکتے ایک چیز کے متعلق کوئی "ہاں" کہتا ہے اور کوئی "نہیں" تو ان میں سے ایک ہی بات درست ہو سکتی ہے۔ یا کسی ایک ذات کو کوئی ایسا جانتا ہے اور کوئی ویسا تو اس صورت میں عقلاً یہ امکان تو ہے کہ دونوں غلط ہوں اور وہ کسی اور طرح کا ہو لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ دونوں باتیں ٹھیک ہوں۔ اب جو درست نقطہ ہے وہ حق ہوگا اور جو غلط ہے وہ باطل قرار پائے گا اس اعتبار سے جب راستے الگ الگ ہیں تو ان میں ایک ہی راستا درست ہے اور وہ صحیح راستا قرآن کی لفظوں میں "الصراط المستقیم" ہوتا ہے جس کا ترجمہ ہوا "سیدھا راستا" علمائے ریاضی نے "خط مستقیم" کی تعریف جو کی ہے وہ بالکل درست ہے کہ دو نقطوں کو ملانے والا سب سے چھوٹا خط جو ہو وہ خط مستقیم ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ریل کی سڑک کی طرح جو چلنے والے کو اکثر سیدھی محسوس ہوتی ہے مگر زیادہ تر وہ دور ہوتی ہے ظاہری نگاہ سے سیدھا محسوس ہونے کے اعتبار سے کسی شاعر نے کہہ دیا۔

"راہ راست برو گرچہ دور باشد"

مگر حقیقت کے لحاظ سے یہ غلط ہے کیونکہ جو وہ ہو وہ آنکھوں کو چاہے راہ راست نظر آتی ہو مگر وہ کج ضرور ہے جب ہی دور ہوئی ہے نہ جو بالکل راست راہ ہو وہ "دور" ہو ہی نہیں سکتی یہی "الصراط المستقیم" وہ ہے جو "صراط الحق" ہو سکتا ہے جسے عقل ہی کی طرح قرآن بھی بس ایک ہی بتاتا ہے۔ اس میں کثرت کا شائبہ نہیں ہے۔ تاکہ "ادیان" کا تصور صحیح ہو۔

اور اس سے قرآن کی روشنی میں جو حقیقت ثابت ہوتی ہے وہ "وحدت دین" ہے۔ نہ کہ "وحدت ادیان" اور اسی کے لحاظ سے "رشد وہدایت" اور "ضلال وغوایت" کی تفریق قائم ہوئی ورنہ سب راستے اگر منزل تک پہنچے ہوں تو ضلالت کا امکان ہی کہاں ہے؟

قرآن کریم کا پہلا ہی صفحہ اٹھیئے اور کسی مسلمان کو تو صفحہ الٹ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہر نماز کا ضروری جز ہونے کی وجہ سے ہر مسلمان کو اس کا حفظ ہونا لازم ہے تو سورۂ حمد ہی کے آخری جملے دیکھیے:-

| | |
|---|---|
| اھدنا الصراط المستقیم صراط | ہماری ہدایت فرما سیدھے راستے کی طرف |
| الذین انعمت علیھم غیر المغضوب | راستا ان کا جنھیں تو نے اپنی نعمت سے نوازا ہے |
| علیھم ولا الضالین | نہ ان کا جو مورد غضب ہیں اور نہ گمراہوں کا۔ |

حالانکہ یہ جماعتیں جنھیں المغضوب علیھم اور الضالین کہا گیا ہے کچھ ادیان کی حلقہ بگوش تھیں تو اگر بنام "دین" جو شے اختیار کر لی جائے وہ حق ہی ہوتی تو وہ جماعتیں "مغضوب علیھم" اور "ضالین" ہوتیں ہی کیوں؟

یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ غلط راستا کبھی غلط سمجھنے کے باوجود صرف کسی عصبیت یا عناد کی بنا پر اختیار کیا جاتا ہے تو یہ انسان کو "مغضوب علیھم" میں داخل کرتا ہے اور کبھی یہ غلط راستا راہ حق کی طلب میں تساہل کی وجہ سے غفلت میں مبتلا ہو کر صحیح سمجھتے ہوئے اختیار کیا جاتا ہے تو وہ چاہے اس حد تک مورد غضب نہ بنائے کہ اس جماعت کا لقب ہی "مغضوب علیھم" قرار پائے پھر بھی "ضالین" میں تو داخل کر ہی دیتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ راستے کے غلط ہونے کی وجہ سے منزل گم ہو جاتی ہے۔

وہ راستا جس کا اختیار کرنا منزل مقصد تک پہنچانے کا سبب ہو سکتا ہے قرآنی

اصطلاح میں الحق ہے۔ الہدیٰ ہے۔ اور اسی کو واحد لفظ کے ساتھ السبیل کہا گیا ہے اور وہی الف لام تعریف کے ساتھ جو فردِ واحد کی طرف اشارہ کا حامل ہے الدّین قرار دیا گیا ہے۔ اسی کی طرف رہنمائی کو اللہ نے اپنی ذمہ داری قرار دیا ہے :-

انّ علینا للھدیٰ (اللیل ۱۲) بلاشبہ ہمارے ذمہ ہے ہدایت کرنا

اسی کا تخلیق کے ساتھ تمام نوعِ انسانی کو ایک وحدت قرار دے کر اس طرح اعلان کیا ہے کہ :-

انا ھدینٰہ السبیل (الدھر ۳) ہم نے اس کی ایک خاص راہ کی طرف ہدایت کی

جبکہ اصل ہادی اللہ ہے اور اس کی ہدایت السبیل یعنی واحد راستے کی طرف ہے تو اس نے اپنی ہدایت کی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے ہر خطۂ ارض میں اور ہر قوم کے اندر اپنی طرف سے رہنما بھیجے۔ اس کے لیے قرآن میں ارشاد کیا ہے :-

ولکل امۃ رسول (یونس آیت ۴۷) ہر قوم کے لیے ایک پیغمبر ہوا ہے۔

چونکہ یہ سب ایک رہنمائی اللہ کے ترجمان تھے اس لیے ان سب کا پیغام ایک ہی تھا اور وہ ایک ہی راستے یعنی دینِ واحد کی طرف دعوت دیتے رہے۔ ان میں باہم اصول کے لحاظ سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ یہ دینِ واحد قرآن کی اصطلاح میں اسلام ہے جس کے معنی ہیں خالق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا اور اسی لیے اسے دینِ کائنات کہا گیا ہے کہ جتنی مخلوق ہے وہ سب غیر ارادی طور پر بھی اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے اور اسی کے ارادی طور پر اختیار کر لینے کی افرادِ انسانی کو تمام انبیاء دعوت دیتے رہے۔ اسی حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے :-

افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السمٰوٰت والارض طوعا وکرھا والیہ یرجعون (آلِ عمران ۸۳)

کیا دینِ الٰہی کے علاوہ کچھ یہ چاہتے ہیں حالانکہ اس کے لیے اسلام اختیار کیے ہوئے ہیں وہ جو آسمان میں ہیں اور زمین میں، خواہ خوشی سے خواہ ناخوشی سے اور اسی کی طرف رجوع ہونا ہے

ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب کوئی انسان ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ نے اسے

والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا
لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین
بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون
ولا یأمرکم ان تتخذوا الملائکۃ
والنبیین اربابا ایأمرکم بالکفر بعد
اذ انتم مسلمون

(آل عمران ۷۹۔۸۰)

کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی ہو پھر وہ
لوگوں سے یہ کہے کہ اللہ کے سوا تم میرے
بندے بن جاؤ بلکہ (اس کا پیغام تو یہی
ہوگا کہ) تم اللہ والے بنو جس طرح تم حق کی تعلیم
دیتے رہے ہو اور جیسا تم پڑھتے رہے ہو نہ وہ اس کا
حکم دے سکتا ہے کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا بنا لو کیا
وہ تمہیں کفر کا حکم دیگا بعد اس کے کہ تم مسلم ہو چکے۔

اور چونکہ ان سب کا راستا ایک ہے اس لیے صراط مستقیم کا تعارف اس طرح کرانا درست ہوا کہ :۔

صراط الذین انعمت علیہم

اُن کا راستہ جنھیں تو نے اپنی نعمت سے نوازا ہے

اور پھر بتایا کہ جنھیں اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا وہ کون ہیں؟ اس طرح کہ

ومن یطع اللہ والرسول فاولئک
مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین
والصدیقین والشہداء والصالحین

(نساء ۶۹)

جو اللہ اور رسول کی اطاعت کریں، تو یہ اُن
کے ساتھ ہیں جنھیں اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا
یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین

اسی حقیقت کا کہ گزشتہ انبیاء نے اسی دین (اسلام) کی تبلیغ کی، اس طرح بھی بیان ہوا ہے کہ :۔

ووصّٰی بہا ابراھمُ بنیہِ و
یعقوب یٰبنیَّ ان اللہ اصطفیٰ
لکم الدین فلا تموتن الا وانتم
مسلمون۔ (بقرہ ۱۳۲)

اور اسی کی ہدایت کی ابراہیم نے اپنی اولاد
کو اور یعقوب نے "اے میرے فرزندو! اللہ نے
تمہارے لیے ایک خاص دین کو منتخب کرلیا
ہے لہٰذا تم دنیا سے نہ اٹھنا مگر مسلم ہونے کی حالت میں۔

اور اس پر اس طرح بھی روشنی ڈالی گئی ہے :۔

ووھبنا لہ اسحٰق ویعقوب

اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب

كلا هدينا ونوحا هدينا من قبل
ومن ذريته داؤد وسليمن و
ايوب ويوسف وموسىٰ وهرون
وكذلك نجزي المحسنين وزكريا
ويحيىٰ وعيسىٰ والياس كل من
الصالحين واسمعيل واليسع و
يونس ولوطا وكلا فضلنا على
العالمين ومن ابائهم وذرياتهم
واخوانهم واجتبيناهم وهدينا
هم الى صراط مستقيم ذلك هدى
الله يهدي به من يشاء من عباده
ولو اشركوا لحبط عنهم ما كانوا
يعملون۔ (انعام ۸۴-۸۹)

ایسی اولاد عنایت کی جن میں سے ہر ایک کو
ہم نے ہدایت دی اور نوح کو اس سے پہلے
ہم نے ہدایت دی تھی اور ان کی نسل میں
داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور
ہارون کو اور اسی طرح ہم حسن عمل قائم رکھنے
والوں کو جزاء دیتے ہیں اور زکریا اور یحییٰ اور
عیسیٰ اور الیاس ہر ایک ہی نیکوکاروں میں
سے تھا اور اسمٰعیل اور یسع اور یونس اور لوط
ہر ایک کو ہم نے تمام جہانوں پر فضیلت دی
اور ان کے آباؤ اجداد میں اور ان کی نسل میں
اور اُن کے بھائیوں میں سے اور انھیں ہم نے
منتخب کیا اور انھیں ہدایت عطا کی ایک سیدھے
راستے کی طرف۔ یہ اللہ کی مخصوص ہدایت ہے جس
سے وہ جسے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے نوازتا
ہے اور اگر یہ لوگ بھی شرک اختیار کرتے تو جتنے
نیک اعمال اُن سے تھے سب اکارت چلے جاتے۔

پھر یہ بھی بتایا کہ یہی انبیاء نہیں ہیں جن کے نام لیے گئے بلکہ اور بھی اللہ کے پیغمبر تھے جن کے نام اور تذکرے قرآن میں نہیں آئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

ورسلا قد قصصناهم عليك
من قبل ورسلا لم نقصصهم عليك
وكلم الله موسىٰ تكليما رسلا مبشرين
ومنذرين لئلا يكون للناس على
الله حجة بعد الرسل (نساء ۱۶۴-۱۶۵)

اور کچھ پیغمبر ایسے ہیں جن کے واقعات ہم نے پہلے آپ سے
بیان کیے ہیں اور کچھ پیغمبر جن کے واقعات آپ سے
بیان نہیں کیے اور اللہ نے موسیٰ سے پورے طور پر
کلام کیا یہ سب پیغمبر آئے ثواب اور عذاب کی خبریں
سناتے ہوئے تاکہ انسانوں کے پاس اللہ کے سامنے

کوئی حجت باقی نہ رہے۔

معلوم ہوا کہ مقصد تمام پیغمبروں کے بھیجے جانے کا بندوں کی حجت کو قطع کرنا ہے اور یہ اتمام حجت اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب پیغام ان سب کا ایک ہو اور ان میں آپس میں کوئی اختلاف نہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

| | |
|---|---|
| وما امروا الا لیعبدوا الٰھا واحد الا الٰہ الا ھو سبحانہ عما یشرکون (توبہ ۳۱) | اور وہ کبھی نہیں مامور ہوئے کسی بات پر سوا اس کے کہ وہ ایک خدا کی عبادت کریں کوئی خدا نہیں سوا اُس کے، وہ بری ہے اُس سے جو وہ شرک کرتے ہیں۔ |

جبکہ دین اصلی ایک تھا۔ وہی حق تھا، وہ صراط مستقیم تھا، وہی صراط الٰہی تھا اور وہی تمام انبیا کا متحد پیغام تھا تو جو ان انبیاء کے سلسلہ کی آخری کڑی اور فرد اکمل ہو کر آئے اس کا بھی پیغام وہی ہو سکتا ہے جو اس کے پیش روؤں کا پیغام تھا۔ اُس سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت کو بھی متعدد جگہ قرآن مجید میں پیش کیا گیا ہے۔ کہیں بطور سوال اس طرح :۔

| | |
|---|---|
| افلم یدبروا القول ام جاءھم مالم یات آباءھم الاولین (المومنون ۶۵) | تو کیا انھوں نے اس پیغام پر غور نہیں کیا؟ واقعی ان کے پاس کوئی ایسی چیز آئی ہے جو اُن کے پہلے اپنے آباواجداد کے پاس نہیں آئی تھی۔ |

مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ وہی پیغام ہے جو تمام انبیا کا پیغام رہا ہے۔ یہ ان کی ناسمجھی ہے کہ یہ اسے کوئی نئی چیز سمجھ رہے ہیں۔ اور کبھی اس طرح :۔

| | |
|---|---|
| انا ارسلناک بالحق بشیرا ونذیرا وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر (فاطر ۲۴) | ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے ثواب اور عذاب کی خبر دینے والا اور (یہ کوئی نئی بات نہیں) کوئی قوم نہیں مگر یہ کہ اس میں کوئی ہدایت کرنے والا آیا ہے۔ |
| بل جاء بالحق وصدق المرسلین (صافات ۳۷) | بلکہ یہ پیغمبر حق کا پیغام لے کر آیا ہے اور |

اس نے اور تمام پیغمبروں کی تصدیق کی ہے۔

انک لتھدی الی صراط مستقیم صراط اللہ الذی لہ ما فی السموات وما فی الارض (شوریٰ ۵۲)

بلاشبہ آپ سیدھے راستے کی طرف دعوت دیتے ہیں، وہ راستہ ہے اللہ کا جس کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔

قل ما کنتُ بدعاً من الرسل (احقاف ۹)

کہیے کہ میں پیغمبروں میں کوئی انوکھا نہیں ہوں۔

اور اس پیغام کے متحد ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اس رسول پر ایمان لائے گا وہ اُن تمام پیغمبروں پر جو آپ کے پہلے تھے ایمان رکھتا ہوگا، چاہے اُن پیغمبروں کا نام نہ جانتا ہو لیکن چونکہ یہ معلوم ہے کہ اللہ کا جو پیغمبر ہو چاہے وہ کہیں بھی ہو اُس کی دعوت یہی تھی اس لیے ان کی صفت یہ ہے کہ:۔

یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک (بقرہ ۴)

وہ اُس پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر اترا ہے اور اُس پر بھی جو آپ سے پہلے اترا ہو۔

قولوا آمنا باللہ وما انزل الینا وما انزل الیٰ ابراھیم واسمٰعیل و اسحٰق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ وما اوتی النبیون من ربھم لانفرق بین احد منھم ونحن لہٗ مسلمون۔ (بقرہ ۱۳۶)

کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اُس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور جو اتارا گیا ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب، اور اولادِ یعقوب پر اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا ہوا اور جو تمام اور پیغمبروں کو اُن کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں کسی میں بھی تفرقہ نہیں کرتے اور ہم اُس کے لیے اسلام اختیار کیے ہوئے ہیں۔

بالکل یہی مضمون دوسری جگہ اس طرح ہے:۔

قل آمنا باللہ وما انزل علینا وما انزل علیٰ ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ والنبیون من ربھم لانفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون (آل عمران ۸۴)

اب جبکہ اصل دین ایک ہے اور تمام انبیاء کا پیغام ایک ہی تھا تو یہ "ادیان" کیونکر ہوئے؟ اس کا سبب "طبعزاد خیالات" ہیں جو کبھی توہم پرستی یا جذبۂ عقیدت میں غلو کی وجہ سے نادانستہ پیدا ہوئے اور کبھی ذوق جدت پسندی یا شوق مذہب تراشی یا شہرت طلبی سے اور کبھی ضد اور کد یا کسی جذبۂ عناد یا حسد سے پیدا ہوئے۔ ان سب کے لیے قرآن مجید نے لفظ "اھواء" صرف کی ہے اور جب "چیز آخر الذکر سبب یعنی عناد و حسد اور ضد و کد سے پیدا ہو تو اسے بغیاً بینھم کی لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ان اھواء کے نتیجہ میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بنام دین کوئی پورا مذہب قائم ہو گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی دین میں جو کسی پیغمبر حق کے ذریعے سے پہنچا ہے کچھ اضافے اور تبدیلیاں کر دی گئی ہوں۔ پہلی صورت میں تو ممکن ہے کہ وہ "دین" سراسر ہی باطل ہو جس میں حق کا کوئی شائبہ ہی نہ ہو لیکن دوسری صورت میں زیادہ امکان یہ ہے کہ کچھ اجزاء حق کے بھی باطل کے ساتھ شامل ہوں۔

بہرحال مجموعی طور پر یہ سب ہی ادیان دین حق کے حریف مقابل قرار پائیں گے اور کسی دین حق کے پیرو کو ان میں سے کسی کی بھی پیروی جائز نہ ہوگی۔

یہ تمام حقیقتیں قرآن مجید کے آیات سے ثابت ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| لن ترضی عنك الیھود ولا النصٰری حتی تتبع ملتھم قل ان ھدی اللہ ھو الھدیٰ ولئن اتبعت اھواءھم بعد الذی جاءك من العلم مالك من اللہ من ولی ولا نصیر (بقرہ ۱۲۰) | یہودی اور عیسائی آپ سے اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتے جب تک آپ ان کے مذاہب کے پیرو نہ ہو جائیں۔ کہیے کہ اللہ کی طرف کا دکھایا ہوا راستہ اصل راستہ ہے اور اگر آپ ان کے "اھواء" کی پیروی کیجیے بعد اس علم کے جو آپ کے پاس آچکا تو آپ کا اللہ کی طرف سے نہ کوئی سرپرست ہوگا اور نہ مددگار |
| ان الدین عند اللہ الاسلام | اصل دین اللہ کے یہاں اسلام ہے۔ |

وما اختلف الذین اوتوا الکتٰب الا من بعد ما جاءھم العلم بغیا بینھم (آل عمران ۱۹)

اور اہل کتاب نے اختلاف نہیں کیا مگر بعد اس کے کہ اُن کے پاس علم آچکا صرف باہمی "بغی" کی وجہ سے۔

بغی سے مراد ہی ضد اور کد اور عناد اور حسد ہے۔

یا اھل الکتاب لا تغلوا فی دینکم ولا تقولوا علی اللہ الا الحق (نساء ۱۷۱)

اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو سے کام نہ لو اور اللہ پر کوئی بات ایسی عائد نہ کرو جو حق نہ ہو۔

قل یا اھل الکتاب لا تغلوا فی دینکم غیر الحق ولا تتبعوا اھواء قوم قد ضلوا من قبل و اضلوا کثیرا و ضلوا عن سواء السبیل (مائدہ ۷۷)

کہیے کہ اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو سے کام نہ لو اور ان لوگوں کے "اہواء" کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہوئے اور بہت سوں کو گمراہ کیا اور سیدھے راستے سے وہ بھٹک گئے

قل انی نھیت ان اعبد الذین تدعون من دون اللہ قل لا اتبع اھواءکم قد ضللت اذا وما انا من المھتدین۔ (انعام ۵۶)

کہیے کہ مجھے منع کیا گیا ہے اس سے کہ میں عبادت کروں اُن کی جن کو تم اللہ کے علاوہ نام لیتے ہو۔ کہیے میں تمہارے "اہواء" کی پیروی نہیں کر سکتا ورنہ گمراہ قرار پاؤں گا اور ہدایت یافتہ لوگوں میں سے نہیں ہوں گا۔

وما کان الناس الا امۃ واحدۃ فاختلفوا (یونس ۱۹)

سب کا شروع میں ایک دین تھا مگر پھر وہ اختلاف میں پڑ گئے۔

فما اختلفوا الا من بعد ما جاءھم العلم (یونس ۹۳)

تو وہ اختلاف میں نہیں پڑے مگر بعد اس کے کہ اُن کے پاس علم آچکا۔

یعنی حقیقت کا علم رکھتے ہوئے دانستہ انھوں نے اختلاف پیدا کیا۔

ولو اتبع الحق اھواءھم لفسدت السموات والارض ومن فیھن۔ (المومنون ۷۱)

اور اگر حق اُن کے "اہواء" کے پیچھے چلے تو آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں سب کا نظام درہم برہم ہو جائے۔

فاقم وجهک للدین حنیفا فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذٰلک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون ۔ منیبین الیہ واتقوہ واقیموا الصلوۃ ولا تکونوا من المشرکین ۔ من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً کل حزب بما لدیھم فرحون ۔

(الروم ۳۰ ـ ۳۲)

رخ رکھو سیدھے اُس دین کی طرف جو نرا کھرا ہے ۔ یہ اللہ کی فطرت ہے ۔ جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے ۔ اللہ کی تخلیق کے تقاضوں میں تبدیلی نہیں ہوتی ۔ یہی سیدھا دین ہے ۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں اُس سے لو لگائے رہو ۔ اور اُس کے غضب سے بچو اور اس کی صحیح عبادت کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو، اُن میں سے جنھوں نے اپنے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے ہر ایک اُسی میں جو اُن کے پاس ہے مگن رہا ہے ۔

آخری جملہ طلب حق میں اُن کے تساہل اور تغافل کو ظاہر کرتا ہے ۔ جس کی بناء پر اُن کا جہل قصوری نہیں بلکہ تقصیری ہو گیا ہے ۔ جس پر انسان معذور قرار نہیں پاتا ۔

شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہ نوحاً والذی اوحینا الیک وما وصّینا بہٖ ابراھیم وموسٰی وعیسٰی ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ ۔ (شوریٰ ۱۳)

اس نے تمہارے لیے وہ دین قرار دیا ہے جس کی اُس نے ہدایت کی نوح کو اور جس کی اُس نے وحی بھیجی آپ کی طرف اور جس کی ہم نے ہدایت کی ابراہیم موسیٰ اور عیسیٰ کو کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں فرقہ بندی نہ کرنا ۔

وما تفرقوا الا من بعد ما جاءھم العلم بغیاً بینھم (شوریٰ ۱۴)

اور وہ تفرقہ میں نہیں پڑے مگر بعد اس کے کہ اُن کے پاس علم آچکا صرف آپس کی کد اور ضد کی وجہ سے ۔

فلذٰلک فادع واستقم کما امرت ولا تتبع اھواءھم (شوریٰ ۱۵)

تو اسی کی بس آپ دعوت دیتے رہیئے اور جیسا کہ آپ مامور ہیں ثابت قدم رہیئے اور ان کے "اہواء" کی پیروی نہ کیجئے ۔

جعلناك على شريعة من الامر فاتبعها ولا تتبع اهواء الذين لا يعلمون

(جاثیہ ۱۸)

ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص راستے پر رکھا ہے اس کی پیروی کیجئے اور ان لوگوں کے "اہواء" کی پیروی نہ کیجئے جو علم سے محروم ہیں۔

وما تفرق الذين اوتوا الكتاب الا من بعد ما جاءتهم البينة وما امروا الا ليعبدوا الله مخلصين له الدين حنفاء ويقيموا الصلوة ويوتوا الزكوة وذلك دين القيمة ط

(البینہ ۴-۵)

اور اہل کتاب تفرقہ میں نہیں پڑے مگر بعد اس کے کہ کھلا ہوا ثبوت اُن کے سامنے آچکا اور انہیں نہیں حکم تھا مگر اس کا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں نری کھری توحید کے ساتھ اور حقوق اللہ اور حقوق الناس ادا کرتے رہیں۔ یہی سیدھا دین ہے۔

فبعث الله النبيين مبشرين ومنذرين وانزل معهم الكتاب بالحق ليحكم بين الناس فيما اختلفوا فيه وما اختلف فيه الا الذين اوتوه من بعد ما جاءتهم البينات بغيا بينهم فهدى الله الذين امنوا لما اختلفوا فيه من الحق باذنه والله يهدي من يشاء الى صراط مستقيم ط

(بقر ۲۱۳)

تو اللہ نے پیغمبروں کو بھیجا ثواب، عذاب کی خبروں کے ساتھ اور ان کے ساتھ اپنا قانون بھیجا حق کے ساتھ تاکہ وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے اُس میں جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اور نہیں اختلاف میں پڑے مگر وہی لوگ کہ جنہیں دیا گیا تھا بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں آگئیں صرف آپسی کی ضد کی وجہ سے تو اللہ نے اپنے حکم سے اُن لوگوں کی جو ایمان لائے رہنمائی فرمائی اُس حقیقت کی طرف جس میں وہ لوگ اختلاف کر رہے اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف ہدایت فرماتا ہے۔

ولا تتبع اهواء الذين كذبوا بآياتنا والذين لا يومنون بالاخرة وهم

اور پیروی نہ کرو اُن لوگوں کے "اہواء" کی جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور جو آخرت

بربھم یعدلون۔ | پر ایمان نہیں رکھتے اور جو اپنے پروردگار کا دوسروں کو ہمسر قرار دیتے ہیں۔

(انعام ۱۵۱)

اب ظاہر ہے کہ یہ ادیان جن کی تشکیل مطابق نصوص قرآنیہ "اہوا" سے اور "بغی" کی بنا پر ہوئی ہے، نہ آپس میں ایک قرار پا سکتے ہیں اور نہ دین حق کے ساتھ متحد سمجھے جا سکتے ہیں۔ تو پھر "اتحاد ادیان" کا تصور کہاں درست ہو سکتا ہے؟

پھر جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ مختلف ادیان میں سے تو بالکل ہو سکتا ہے کہ سب باطل ہوں اور حق کوئی اور ہو مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ سب حق ہوں۔ پھر بھی چوں کہ حق کا پیغام ایک نہ ایک پہونچا ہے اور ہمیشہ پہونچتا رہا ہے جس کی ذمہ داری خالق نے ان علینا للھدیٰ کے ساتھ کی ہے تو معرکۂ ادیان و مذاہب میں ضرور ایک دین حق بھی ہے لہذا امتیاز حق و باطل کی ضرورت اور اسی کا مختتم فیصلہ ہے جسے قرآن نے کہا ہے کہ وہ قیامت میں ہوگا۔ جب دودھ اور پانی بالکل الگ ہو جائے گا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

انّ الّذین فرّقوا دینھم وکانوا شیعاً لست منھم فی شیءٍ انّما امرھم الی اللّٰہ ثمّ ینبّئھم بما کانوا یفعلون۔

(انعام ۱۶۰)

بلاشبہ وہ جنھوں نے دین میں تفرقہ ڈالا اور مختلف گروہ میں بٹ گئے۔ آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انکا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پھر وہ انھیں بتلائیگا کہ اُن کے کیا کرتوت تھے۔

ام لھم شرکٰٓؤا شرعوا لھم من الدّین مالم یاذن بہ اللّٰہ ولولا کلمۃ الفصل لقضی بینھم وانّ الظّالمین لھم عذاب الیم۔

(شوریٰ ۲۱)

کیا اُن کے کچھ ایسے خدائی کام میں شرکت کرنے والے ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین نافذ کردیا جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی تھی اور اگر فیصلہ کا دن مقرر نہ ہوتا تو ان کا فیصلہ کب کا ہو چکا ہوتا اور بیشک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

ان اللّٰہ یحکم بینکم یوم القیٰمۃ فیما کنتم فیہ تختلفون (حج ۶۹)

اللہ تمہارے درمیان روز قیامت فیصلہ کریگا۔ اُن چیزوں کی بابت جن میں تم باہم اختلاف رکھتے تھے۔

اگر ادیان متحد ہوتے یا سب ہی برحق ہوتے تو قیامت میں فیصلہ ہی کا ہے کا تھا؟ پھر یہ فیصلہ کوئی لفظی نہیں ہے جو بس سنا دیا جائے بلکہ وہ حسنِ انجام اور سوئے انجام کی شکل میں سامنے آنے والا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

ولقد ارسلنا رسلا من قبلک منهم من قصصنا علیک ومنهم من لم نقصص علیک وما کان لرسول ان یاتی بآیة الا باذن الله فاذا جاء امر الله قضی بالحق وخسر هنالک المبطلون (مومن ۷۸)

اور ہم نے آپ کے پہلے بہت پیغمبر بھیجے۔ اُن میں سے وہ بھی ہیں جن کے واقعات ہم نے آپ سے بیان کئے ہیں اور وہ بھی ہیں جن کا تذکرہ آپ سے نہیں کیا ہے اور کسی پیغمبر کے لیے یہ نہیں ہے کہ وہ کوئی معجزہ پیش کر سکے۔ مگر اللہ کی اجازت سے تو جب اللہ کا حکم آئیگا تو حق کے ساتھ فیصلہ ہو جائیگا اور جو باطل پر ہیں اس موقع پر خسارہ میں رہیں گے۔

پھر ارشاد ہوا ہے۔

فلما جاءتهم رسلهم بالبینات فرحوا بما عندهم من العلم وحاق بهم ما کانوا به یستهزءون۔ فلما راوا باسنا قالوا آمنا بالله وحده وکفرنا بما کنا به مشرکین۔ فلم یک ینفعهم ایمانهم لما راوا باسنا سنة الله التی قد خلت فی عباده وخسر هنالک الکافرون

(مومن ۸۳)

تو جب اُن کے پاس اُن کے پیغمبر کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے تو وہ مگن رہے اس علم میں جو اُن کے پاس تھا اور جس کا انہوں نے تمسخر کیا۔ اسی عذاب میں مبتلا ہوئے تو جب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا تو کہنے لگے کہ اب ہم اکیلے اللہ پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جنھیں شریک قرار دے رہے تھے اُن کے ہم منکر ہوتے ہیں تو یہ ایمان لانا انھیں فائدہ نہیں پہنچا سکتا جب کہ انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھ لیا۔ یہی اللہ کا طریقہ ہے جو اس کے بندوں میں جاری رہا ہو۔ اور اس موقع پر کافر لوگ خسارہ اٹھائیں گے۔

اور سنیئے۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین

جو اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں ہوگا۔

(آل عمران ۸۵)

ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءھم البینات واولئک لھم عذاب الیم ط

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو تفرقہ میں پڑ گئے اور باہمی اختلافات میں مبتلا ہو گئے اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں آ چکیں اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

(آل عمران ۵)

اب قرآن مجید کے اتنے کثیر التعداد تصریحات کے ساتھ یہ تصور بھی کہاں صحیح ہو سکتا ہے کہ اسلام نجات کو کسی خاص معتقدات کے ساتھ وابستہ نہیں کرتا بلکہ جس دین کا بھی چاہے پیرو ہو، بس اعمال درست رکھے۔ یہ کافی ہے۔

یہ تصور ہرگز اسلامی تعلیم کی رو سے درست نہیں ہے۔ ورنہ پھر اسلام وکفر کا کوئی محاذ ہی رسولؐ اور ان کے مخالفین کے درمیان کیوں قائم ہوتا اور تصدیق وتکذیب کے درمیان خط فاصل ہی کیوں کھنچتا؟ کیوں کہ جو مکذبین ہوتے ہیں وہ بھی کچھ معتقدات تو رکھتے ہی ہیں۔ ان کو ان کے معتقدات کے خلاف کسی پیغام کے دینے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ صرف عملی واخلاقی تعلیمات پر اکتفا کی جاتی مگر ایسا نہیں ہوا۔ اور رسول کو بڑے ہنگامہ کا مقابلہ اپنی صرف اس تبلیغ کی رو سے کرنا پڑا جو دوسروں کے معتقدات کے خلاف تھی۔

اس سلسلے میں چند آیتیں اور پڑھیے۔

وقالوا کونوا ھوداً او نصاریٰ تھتدوا قل بل ملۃ ابراھیم حنیفاً وما کان من المشرکین ط

وہ کہتے ہیں کہ یہودی ہو، عیسائی ہدایت پاؤ گے کہیے کہ نہیں بلکہ ابراہیم کی نری کھری ملت اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے۔

(بقرہ ۱۰۰)

آخری جماعات اس بات کا مظہر ہے کہ اب یہودیت اور نصرانیت جس کا نام ہے ان میں شرک شریک ہوگیا ہے اس لیے وہ ذریعہ ہدایت نہیں ہے ہاں اس شرک کو نکال دیا جائے تو پھر خالص اسلام ہو جائیگا۔ جو دین حنیفی ابراہیمی کا نام ہے۔

وانک لتدعوھم الی صراط مستقیم وان الذین لا یومنون بالآخرۃ عن الصراط لناکبون

(حج ۷۲)

بلاشبہ آپ انہیں ایک سیدھے راستہ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ صراط مستقیم سے منحرف ہیں۔

وان یکذبوک فقد کذب الذین من قبلھم جاءتھم رسلھم بالبینات والزبر والکتاب المنیر۔ ثم اخذت الذین کفروا فکیف کان نکیر

(فاطر ۲۵)

اور اگر یہ آپ کو جھٹلاتے ہیں (تو کوئی تعجب کی بات نہیں) اُن کے پہلے والوں نے بھی جھٹلایا تھا۔ جن کے پاس اُن کے پیغمبر کھلی ہوئی دلیلیں اور کتابیں اور روشن قانون لے کر آئے تھے۔ پھر جنہوں نے کفر اختیار کیا انھیں میں نے اپنی گرفت میں لے لیا تو دیکھا تم نے کہ کیسا تھا میرا عذاب

اب جب کہ عمومی طور پر غیر اسلام تمام ادیان کو اور یہود و نصاریٰ کو خصوصی طور پر تام لے کر بتایا گیا کہ وہ باطل کے راستے پر ہیں اور نجات اخروی سے محروم ہیں تو قرآن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش فضول ہے کہ دینی عقائد کا نجات کے مسئلہ میں کوئی اعتبار نہیں اور جس دین کا بھی پیرو ہو بس اعمال درست ہوں۔ یہ وحدت، ادیان کا تصور بھی غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

پھر دو آیتیں ایک مضمون کی اس کے خلاف اور ملاحظہ ہوں جن کے مشترکہ الفاظ یہ ہیں۔

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہ

(توبہ ۳۳ و فتح ۲۸)

وہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کے علاوہ ہر دین پر اسے غلبہ عطا کرے۔

اس کے بعد اب اس حقیقت پر ذرا بھی نقاب نہیں رہی کہ اسلام اور قرآن سے جو

ثابت ہے وہ وحدت دین ہے نہ کہ وحدت ادیان ہاں ایک دوسری چیز ہے "اتحاد اہل ادیان" اس کے لیے قرآن مجید دو بنیادیں پیش کرتا ہے۔ ایک اُن ادیان سے متعلق ہے جو کسی رہنمائے حق کی طرف نسبت اور کسی اصل صحیح سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان میں یقیناً کچھ باقی ماندہ آثار اُس پیغام حق کے موجود ہوں گے جو اُن انبیاء کے ذریعہ سے پہونچا تھا اور وہ بلا شبہ دین حق سے متحد ہوں گے۔ جس کے ساتھ "اہواء و بدع" کی شرکت نے کچھ الحاقی اجزاء کا اضافہ کر دیا ہے جس نے اُس دین کو ایک علیحدہ صورت دیدی ہے لہذا کرنے کا کام یہ ہے کہ ان تمام ادیان سے اُن خطوط مشترکہ کا استخراج کیا جائے جو ان سب میں متفقہ حیثیت رکھتے ہیں اور ان اصول کو ایک پرچم کی حیثیت سے فرض کر کے اُس کے زیر سایہ ان تمام مذاہب کے ماننے والے متفق ہو جائیں۔

یہ بنیاد وہ ہے جس نے قرآن مجید نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ و لا نشرک بہ شیئا و لا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ (آل عمران ۹۰) | کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ اُس بات کی طرف جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں حیثیت رکھتی ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اُس کا شریک قرار نہ دیں اور کچھ افراد ہم میں کے دوسرے افراد کو اللہ کے علاوہ رب نہ ماننے لگیں۔ |

اُس وقت کے ماحول کی بناء پر اگرچہ یہاں مخاطب اہل کتاب ہی کو بنایا گیا ہے جس سے مراد یہود و نصاریٰ ہوتے ہیں لیکن اگر تلاش کی جائے تو دوسرے ممالک کے قدیم رہنماؤں کے تعلیمات میں بھی مشترکہ اقدار مل جائیں گے اور وہی قرینہ ہیں اس کا کہ وہ رہنما اسی سلسلۂ حق کی کڑی تھے جس کے افراد سے کوئی ملک خالی نہیں رہا ہے اور ان مشترکہ اقدار کو لے کر ایک اتحادی مرکز ان تمام اہل ادیان کا قائم کیا جا سکتا ہے جس سے نوع انسانی کو بیش قرار فائدہ حاصل ہونے کے امکانات ہیں۔

دوسری صورت وہ ہے جسے موجودہ زمانہ کے اصطلاحات کے لحاظ سے "بقائے باہم"

کا اصول کہنا چاہیئے جس کو آج کل کے متضاد نظام ہائے فکر کے درمیان بطور ایک نباہ کی شکل کے امن عالم کے مفاد کے لیے تجویز کیا گیا ہے مگر وہ چودہ سو برس پہلے قرآن پیش کر چکا ہے۔ اپنے اس مستقل ایک سورۃ میں جو "سورۂ کافرون" کے نام سے موسوم ہے جس کا مرکزی مقصد اُس کے آخری جملہ میں مضمر ہے کہ "لکم دینکم ولی دین"

یہ طریقہ اُن مذاہب پر بھی حاوی ہے جن کا کسی رہنمائے حق سے کوئی علاقہ نہ ہو اور جن میں دین صحیح کے ساتھ کوئی نقطۂ مشترک نہ ہو تو ان کو آپس میں اسی بنیاد پر سمجھوتا کر لینا چاہیئے ایک دوسرے کے ساتھ تعرض نہ کرے اور اگر افہام و تفہیم کے ذریعہ سے ایک نقطہ پر جمع ہونا ممکن نہ ہو تو پر امن طریقہ پر زندگی گزارنے کے لیے لازمی یہی صورت اختیار کرنا پڑے گی جسے صحیح حدود میں سیکولر نظام کی بنیاد بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

# معیار فلاح و نجات

آج کل یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ انسان کے لیے فلاح و نجات کے لیے بس یہ کافی ہے کہ وہ عملی حیثیت سے اچھا آدمی ہو۔ مثلاً جھوٹ نہ بولتا ہو۔ دیانتدار ہو، خیانت نہ کرتا ہو، انصاف پسند ہو، ظلم و تعدی سے پرہیز کرتا ہو، امن پسند ہو، فتنہ و فساد سے علیحدہ رہتا ہو، یہ سب اچھے اوصاف جس میں ہوں وہ نجات کا مستحق ہے۔ اس کے علاوہ کسی عقیدہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اللہ کو ایک مانو۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا کا رسول سمجھو۔ آخرت کو تسلیم کرو، قیامت کا یقین کرو۔ غرض کہ دین کے ساتھ جو ایک دینا معتقدات کی وابستہ کر دی گئی ہے۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ خیال اگر قرآن اور حدیث سے بالکل بیگانہ اشخاص کی طرف سے پیش ہوتا تو اس پر بحث دوسری طرح ہونا چاہیئے تھی مگر چوں کہ یہ خیال کچھ مذہبی حلقوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس لیے اس پر بحث کے سلسلہ میں سب سے پہلے قرآن سے فیصلہ طلب کرنا مناسب ہو گا۔ جب ہم قرآن پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ قرآن نجات کے لیے ایمان اور عمل صالح دونوں کی ضرورت بتلاتا ہے۔

علاوہ ان کثیر التعداد آیتوں کے جہاں مجمل طور پر نعیم اخروی کے وعدوں میں ایمان اور عمل صالح کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ کافی تفصیل سے کام لیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے۔

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق و المغرب و لکن البر من آمن باللہ والیوم الاخر و الملئکۃ و الکتاب والنبیین و آتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتامی والمساکین وابن السبیل والسائلین و فی الرقاب و اقام الصلوۃ و آتی الزکوۃ و الموفون بعھدھم اذا عاھدوا والصابرین فی الباساء والضراء وحین الباس اولئک الذین صدقوا و اولئک ھم المتقون۔

(بقرہ)

اس کا واضح خلاصہ یہ ہے کہ نیک آدمی ہونا صرف کسی ایک طرح کے عمل سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے ضرورت ہے کہ اللہ اور روز آخرت وغیرہ پر ایمان ہو اور پھر عمل صالح ہو جس کا ایک فہرست پیش کر دی ہے جس میں حقوق اللہ بھی ہیں اور حقوق الناس بھی۔ اور یہ سب باتیں اَوْ۔ اَوْ کے ساتھ نہیں ہیں جس کے معنی یہ ہوتے کہ یا ایمان ہو یا خیرات ہو یا نماز ہو۔ اس صورت میں ان میں سے ایک بات اگر ہوتی تو نیک آدمی ہونے کے لیے کافی ہوتی مگر یہاں تو وہ سب باتیں و۔ و۔ و کے ساتھ بیان کی ہوئی ہیں جس کے معنی ہماری اُردو زبان میں اور۔ اور۔ اور۔ کے ہوتے ہیں اس کا تقاضا ہے اجتماع اوصاف۔ کہا جا رہا ہے کہ نیک آدمی ہونے کا معیار ہے اللہ اور روز آخرت وغیرہ پر ایمان اور نماز کا قائم رکھنا اور زکوٰۃ دینا وغیرہ وغیرہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام اوصاف کو نیک ہونے میں دخل ہے۔ ان میں سے بعض ہوں اور بعض نہ ہوں تو نیکی کا مصداق حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر کوئی بڑا صاحب ایثار ہے اور دوسروں کے دکھ درد میں کام آتا ہے۔ سچ بولتا ہے۔ کسی کو آزار نہیں پہونچاتا مگر عقیدہ کچھ نہیں رہتا۔ ایمان نام کی کوئی چیز اس کے دل و دماغ کے کسی گوشہ میں نہیں ہے تو قرآن کے رو سے وہ نیک آدمی نہیں ہے اور اُس حسن انجام میں بھی اس کا حصہ نہیں ہے جس کا قرآن نے نیک آدمیوں کے لیے اعلان کیا ہے۔

---

اب آیئے عقلی طور پر غور کریں کہ حسن عمل کے ساتھ حُسنِ اعتقاد یا ایمان کی ضرورت کیا ہے اور اہمیت کس لیے ہے؟

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ افعال و اعمال انسان کے اعضاء و جوارح سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اعتقادات اُس کے دماغ و ذہن سے۔

اگر انسان فاعل مختار نہ ہوتا۔ اُس کے افعال بالطبع ہوتے، بالارادہ نہیں تو اُس کے افعال میں نیت و ضمیر کا دخل اور دماغ و ذہن سے اُن کا ربط نہ ہونا ٹھیک تھا مگر انسان کا کمال تو اس کے جوہر اختیار میں مضمر ہے اور اختیار نفس سے متعلق ہے جس کی کارفرمائی ذہن و دماغ کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔

بغیر کسی عقیدہ کے مشق و عادت سے عمل ہو سکتا ہے۔ جیسے ایک ماں باپ نے ابتدائے عمر سے بچہ کو نماز پڑھنا سکھایا تو ماں باپ نے یہ ایک عادت ڈال دی ہے کہ ادھر صبح نمودار ہوئی اور فوراً اس کی آنکھ کھل گئی۔ اٹھا اور نماز پڑھی۔ ظہر و عصر کا وقت ہوا اور یہ مسجد میں پہونچ گیا نماز پڑھ لی۔ اسی طرح مغرب اور عشاء کے وقت۔ یہ ماں باپ نے ایسی عادت ڈال دی ہے کہ نماز کا وقت آتے ہی یہ بےچین ہو جاتا ہے۔ جب تک نماز پڑھ نہیں لیتا طبیعت بے قرار رہتی ہے. کسی کام میں دل نہیں لگتا اور معلوم ہوتا ہے ایک بوجھا ہے سر پر جسے اتارنا ضروری ہے لیکن اگر یہ عبادت صرف بربنائے عادت ہے تو اس کا اثر نماز ہی کی حد تک رہے گا، اس کے دوسرے کردار پر اثر نہیں پڑے گا۔

جیسا کہ بہت سے نمازیوں میں روزمرہ کا مشاہدہ ہے اور اسے اس دور میں مذہب اور پابندی مذہب کے خلاف بطور اعتراض پیش کیا جاتا ہے کہ وہی جو نماز کا اتنا پابند ہے۔ اگر کسی کا پیسہ اس کے ذمہ واجب الادا ہو تو یہ اس کی ادائی کے لیے یا کسی کی امانت اس کے پاس ہو تو اس کی حفاظت و واپسی کے لیے ایسا بےچین نظر نہیں آتا مگر درحقیقت یہ اسی وجہ سے ہے کہ اس کی عبادت عادت کا نتیجہ ہے اس میں وہ روح نہیں ہے جس کا قربۃً الی اللہ کے الفاظ جو نیت نماز میں اس نے سیکھے ہیں تقاضا رکھتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ عادت ایسی چیز ہے جو انسان کو کسی کارِ خیر کا پابند بنا سکتی ہے مگر مشق و عادت کا نتیجہ جزئی ہوگا۔

اسی صورت سے کہ کسی کو ماں باپ کی تربیت یا کسی اچھے ماحول کے اثر سے سچ بولنے کی مشق ہو گئی ہے۔ یہ سچ بولنے کی عادت چوں کہ زبان سے متعلق ہے لہٰذا زبان اس کی پابند ہو جائے گی۔ مگر اسی زبان سے یہ کسی کی دل آزاری نہ کرے۔ اس زبان سے یہ چغلی نہ کھائے۔ اس زبان سے اشتعال انگیزی کرکے یہ فساد نہ کرائے۔ یہ سب اس مشق کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔

پھر سچ بولنے کی اسے عادت ہے تو یہ اس سچ کے محل کو دیکھے اور اس کے نتائج پر غور کرے ایسا نہیں ہوگا۔

اب اگر کسی نے دوسرے کو گالیاں دیں اور اسی نے اپنی سچ کی عادت کی بنا پر اس دوسرے

سے بالکل ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا کہ فلاں نے تم کو یہ کہا ہے تو بہت ممکن ہے یہی سچ ایک بڑی خونریزی کا سبب بن جائے اسی طرح متعدد گناہان کبیرہ ہیں جو سچ ہی سے عالم وجود میں آتے ہیں۔ وہ سچ بولنے کی عادت ان گناہوں سے بچا نہیں سکتی بلکہ وہی ان گناہوں کی محرک ہو سکتی ہے۔

اسی طرح ہر کام جو عادت کی بناء پر وقوع میں آئے وہ یقیناً محدود حیثیت رکھے گا اور انسان کی پوری زندگی پر اثر انداز نہیں ہو گا۔

حقیقۃً تمام اعضاء انسانی پر جو حکمراں ہے وہ نفس ہے۔ اعضاء کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر فعل الگ ہے اور فاعل بھی الگ الگ ہیں۔

مثلاً دیکھنا آنکھوں کا کام ہے، پیروں سے کوئی تعلق نہیں۔ چلنا پیروں کا کام ہے، کان سے کوئی تعلق نہیں ہے ——— وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ تمام افعال نفس کی منزل میں جا کر سمٹ جاتے ہیں۔

دیکھا آنکھوں نے مگر یہ شخص کہیگا میں نے دیکھا۔ سنا کانوں نے وہ کہیگا میں نے سنا۔ اٹھایا ہاتھ نے مگر وہ کہیگا میں نے اٹھایا۔

معلوم ہوا کہ نفس انسان وہ ہے جو تمام اعضاء پر حاوی ہے اب اگر کوئی چیز نفس پر اپنا اثر قائم کر دے تو اس کے بعد اعضاء کو الگ الگ مشق کرانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہی نفس کا تاثر تمام اعضاء کو پابند بنا دے گا۔ اعتقاد و ایمان وہی چیز ہے جو براہ راست نفس پر اپنا سکہ جماتا ہے اور جب ایمان نے نفس کو مسخر بنا لیا تو ایک سانچا کردار کا بن گیا جس میں ڈھل کر تمام افعال ضبط و نظام کی پابندی کے ساتھ، بلند مقاصد کے تحفظ کی نگہداشت کے ساتھ ہوں گے اس سانچے کا نام قرآنی اصطلاح میں "تقوے" ہے اور وہ بغیر ایمان وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ بغیر اعتقاد کے عمل کے لیے کوئی پس منظر مہیا نہیں ہوتا جیسے عمارت ہو اور اس کی کوئی بنیاد نہ ہو۔ درخت ہو اور اس کی جڑیں نہ ہوں۔

عقائد اور اعمال کے لیے اصولِ دین اور فروعِ دین کی اصطلاح اسی حقیقت کی مظہر ہے جس طرح درخت کی جڑیں اندر اندر پھیلتی ہیں، اور شاخیں آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔

اسی طرح اعتقادات دل و دماغ کے اندر جگہ پکڑتے ہیں اور اُن کا اثر اعضائے جسم سے افعال کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

اب اگر شاخیں نظر نہ آئیں تو یقین کرنا چاہیئے کہ اصل کمزور ہے کیوں کہ اگر اصل طاقتور ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ شاخیں نمایاں نہ ہوں۔

جب شاخیں مفقود ہیں یا ہیں لیکن خشک ہیں تو ان شاخوں کے ہرا کرنے کے لیئے شاخوں کو پانی سے بھگویا نہیں جائے گا بلکہ جڑ کو پانی دیں گے۔ اسی سے شاخیں تروتازہ ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح ہم میں اگر عملی کمزوریاں ہیں تو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہمارا ایمان مستحکم ہے بلکہ یہ درحقیقت عقائد ہی کی کمزوری ہے جو اعمال میں کوتاہی کی باعث ہے۔

اسی طرح اگر اصل موجود نہ ہو اور صرف شاخیں تروتازہ نظر آئیں تو یہ شاخیں یقیناً نمائشی ہوں گی۔ وہ اس درخت کی شاخیں ہی نہ ہوں گی۔ نہ وہ مستحکم ثابت ہو سکتی ہیں۔ جب تک کسی تیز آندھی کا جھوکا نہیں آیا۔ یہ شاخیں قائم ہیں اور ادھر کوئی تیز آندھی چل گئی، انقلاب کا کوئی طوفان آگیا اور بس یہ شاخیں غائب ہو گئیں۔

ان نمائشی شاخوں سے رونق چمن ہو سکتی ہے اور ایک محدود وقت تک اُن کا سایہ باعث آرام بھی ہو سکتا ہے مگر ان شاخوں سے ثمر ملنا غیر ممکن ہے۔ ثمرہ اُن ہی شاخوں سے حاصل ہو سکے گا جو اصل سے متصل ہوں۔

یہی تعلق عقائد و اعمال کا باہمی ہے۔ اگر اعمال نہیں ہیں تو ایمان یا تو ہے ہی نہیں اور یا ہے تو اتنا کمزور کہ حیات میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کر سکتا اور اعمال اگر بغیر صحیح عقائد کے ہیں تو وہ وقتی ہیں۔ ان میں کوئی پائداری نہیں اور ان سے ثمرۂ نجات حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ اعمال یا بطور عادت ہیں یا کسی حکمت عملی سے بطور نمائش ہیں۔ لہٰذا اُن پر اعمال صالحہ کا اطلاق بھی واقعتہً درست نہیں ہے۔

ہاں اگر ایمان ہو اور کردار اُس کے مطابق ہو تو وہ اس شخص کے لیے بھی نتیجہ خیز ہے اور دوسروں پر بھی اثر انداز۔

ایمان تو دل کے اندر کی چیز ہے وہ بذات خود دوسروں کو متاثر نہیں بنا سکتا۔

جذابیت تو ان ہی افعال و اعمال سے ہوتی ہے جو اُس ایمان کے نتائج و آثار ہیں۔
حق کے پرستاروں میں یہ جو ہر موجود ہو تو زبان سے تبلیغ کی زیادہ ضرورت نہیں۔ صحیح
کردار ہی بہترین مبلغ ہو سکتا ہے۔
مگر یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب حسن عمل ہو اور اس کے پس پشت صحیح اعتقاد
اور ایمان کی قوت موجود ہو۔
اسی لیے قرآن مجید نے ہر جگہ اپنی بشارت کو ایمان اور عمل صالح دونوں کے ساتھ
وابستہ کیا ہے،

# اسلام عہدِ حاضر میں

اسلام تو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا (اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ) اور اس کے ہمہ گیر دائرہ سے کائنات میں کسی کے نکلنے کا امکان ہی نہیں ہے چاہے کوئی اختیاری طور پر اُس کے قبول کرنے پر تیار نہ ہو، تب بھی اضطراری طور پر اس کی پابندی کرنا ہے (وَلَهُ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْهًا) لیکن وہ محرکات جو ارادی طور پر دینِ اسلام کو قبول کرنے کے متقاضی ہوں مختلف ادوار میں کم اور زیادہ ہو سکتے ہیں اور اسی اعتبار سے کسی عہد کے متعلق خصوصیت سے غور کیا جا سکتا ہے کہ اس میں قبولِ اسلام کے لیے فضا کی کیفیت کیا ہے؟

اس اعتبار سے جب دیکھا جاتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ عہدِ حاضر سے زیادہ کبھی بھی اسلام کے لیے مناسب فضا نہ تھی اور عہدِ حاضر اپنے خصوصیات میں جتنی ترقی کرتا جائے گا اتنی اسلام کے لیے فضا زیادہ سازگار ہوتی جائے گی اور دنیا شعوری طور پر نہ سہی تو لاشعوری طور پر اسلام سے زیادہ قریب آتی جائے گی۔ اس کے لیے مختصر طور پر چند پہلو پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱)

وہ اور مذاہب ہوں گے جنھوں نے عقل کے دروازے بند کیے ہیں اور تعقل و تفکر سے خطرہ محسوس کیا ہے۔ اسلام نے ہمیشہ صاحبانِ عقل کو مخاطب کیا ہے اور تعقل و تفکر سے کام لینے کی دعوت دی ہے، اس لیے دنیا کا تعقل و تفکر کی طرف مائل ہونا جو موجودہ دور کی خصوصیت ہے، اسلام کی حقانیت کے ثبوت کے لیے فالِ نیک ہے اور جتنی جتنی دنیا غور و فکر سے زیادہ کام لینے پر آمادہ ہو گی اتنی ہی حقائقِ اسلامیہ سے قریب آئے گی۔

(۲)

اسلامی تعلیمات عقلِ عمومی اور حاسۂ اجتماعی اور فطرت کے تقاضوں سے انتہائی ہم آہنگ ہیں۔

جو چیزیں اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں وہ روایات قدیمہ کی پابندیاں، تقلید آباد اور موجودہ مذاہب کے رسوم کی زنجیریں ہیں۔

موجودہ دنیا کا لا مذہبی کا رجحان اور قدیم رسوم سے بغاوت کا جذبہ جتنا ترقی کریگا اتنی وہ عقل و فطرت کے سچے فیصلوں کے قبول کرنے پر تیار رہوگی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لا مذہبیت اس مذہب کے لیے زمین ہموار کرتی ہے جو عقل و ضمیر کی تشنگی کو صحیح معنی میں بجھائے اور یوں سمجھنا چاہیئے کہ اس خرابی میں تعمیر کی صورت پنہاں ہے اور یہ برق خرمن باطل کو نیست و نابود کرنے کے ساتھ دین حق کے لیے آشیانہ سازی کا کام انجام دے سکتی ہے۔

(۳)

غالب نے جس نفسیاتی اور طبعی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ:۔

"درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"

اس کے مطابق موجودہ دور کی سائنسی ترقیوں نے الحاد کے ساتھ مل کر جو تباہ کاری پیدا کی ہے اس نے انسانی قلب و ضمیر کو بہت بے اطمینان بنا دیا ہے اور یہ بے اطمینانی اپنی انتہائی حدوں تک جا کر انسان کی کشتی ذہن کو ایک ساحل اطمینان کی تلاش پر مجبور کر رہی ہے اور یہ اطمینان اسے صحیح معنی میں اسی خدا شناسی میں مل سکتا ہے، جس کے لیے قرآن نے ارشاد کیا ہے۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب — اللہ کی یاد ہی سے بے قرار دلوں کو سکون و اطمینان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔

(۴)

اسلام کا سب سے بڑا حریف اس آخری دور میں جو میدان میں آیا تھا وہ کمیونزم تھا۔ مگر اسٹالن کے بعد سے اس میں جو اختلاف و انتشار پیدا ہوا ہے اس نے اسے مادی حیثیت سے بہا ہے ابھی زیادہ کمزور نہ کیا ہو مگر اعتقادی و عملی میدان میں اسے شکست فاش دے دی

ہے اس لیے کہ جن باتوں کا الزام مذہب کے خلاف عائد کرکے لوگوں کو اس سے منحرف کیا جاتا تھا وہی سب باتیں خود کمیونزم میں سب کے سامنے آگئی ہیں۔ یہاں تک کہ اب اس کے اندر بھی فرقے پیدا ہو گئے جن کا اختلاف طشت از بام ہے۔ جس طرح اہل مذاہب بنام مذہب آپس میں لڑتے تھے اسی طرح یہ فرقے کمیونزم کے نام پر آپس میں جنگ کر رہے ہیں۔ اس طرح جب کہ اسلام کے سب سے بڑے حریف کا جو اس دور میں تھا تنزل شروع ہو گیا تو لازمی طور پر اس سے اسلام کے از سرنو ارتقاء کے لیے فضا سازگار ہو رہی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ آخر میں وہ اپنے سب سے آخری حریف کو مکمل شکست دے کر پوری قوت حاصل نہ کرے اور اس کے بعد امکان قریب ہے کہ آخر میں تمام عالم پر چھا جائے جس کی خبریں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متواتر احادیث میں دے چکے ہیں۔

(۵)

اسلامی تعلیمات کا فطرت سے بہت قریب ہونا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا آزاد فکر سے کام لے کر شعوری یا لاشعوری طور پر بنام "اصلاحات" یا "ترقیات" شریعت اسلامی کے احکام کو قبول کر رہی ہے۔ مثلاً جہاں عقد بیوگان نہ تھا۔ وہاں عقد بیوگان کی ترویج کی کوشش ہوتی ہے جہاں لڑکیوں کا میراث میں حصہ نہ تھا۔ وہاں لڑکیوں کو میراث میں ترکہ ملنے کا قانون بنتا ہے جہاں شادی کے بعد [illegible] نہ تھا وہاں قانون طلاق کا نفاذ ہوتا ہے۔ جنگ کا نام "دفاع" ہو گیا جو بالکل قرآنی اصطلاح کے مطابق ہے، ذات پات کی تقسیم کے غلط ہونے کا احساس سب کو ہے۔ کالے اور گورے کی تفریق کے حقوق انسانی میں باطل ہونے پر تمام متمدن دنیا متفق ہو گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان چیزوں کے عملی طور پر نفاذ میں دشواریاں پیش آ رہی ہوں مگر نظری طور پر اسلامی تصورات کے سامنے دنیا سر تسلیم خم کر چکی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ منزل بھی آجائیگی کہ رکاوٹیں ختم ہوں اور یہ باتیں عملی طور پر بھی نفاذ پذیر ہو جائیں۔

(۶)

دنیا جس چیز کے لیے اس وقت سب سے زیادہ بے تاب ہے وہ اخوت اور

مساوات ہے اور اخوت و مساوات کا جتنا مکمل درس قرآن نے دیا ہے وہ دنیا کے کسی قانون اور نظام میں نہیں ملتا۔ اس لیے بھی دنیا اسلامی نظام کو قبول کرنے کے لیے کسی نہ کسی مرحلہ پر مجبور رہے۔

(۷)

دولت کی تقسیم کے بارے میں سرمایہ داری کے خراب نتائج کے رد عمل میں دنیا نے اشتراکیت کو قبول کیا جو کہ اس راہ میں افراط کا نقطہ ہے۔ اب اس افراط کے خراب نتائج کا مشاہدہ کرکے اس نے قدم پیچھے ہٹانا شروع کر دیئے ہیں۔ چنانچہ روس وغیرہ میں محدود درجہ تک انفرادی ملکیت اور شخصی جائداد کے حق کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس طرح تفریط اور افراط کے دونوں نقطوں کے تجربہ کے بعد اس اعتدال ہی کی منزل رہ جاتی ہے جس کا اسلام علمبردار رہے۔

(۸)

سرمایہ داری اور اشتراکیت کا آپس کا ٹکراؤ جس میں ایک جانب امریکہ کی طاقت ہے اور دوسری طرف روس اور چین۔ اور دونوں ہی طرف قہار طاقتیں ہیں جو ترقی کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اس ٹکراؤ کے نتیجہ میں ان کے درمیان ایک سرد جنگ بھی ہے اور وہ یہ کہ ہر ایک اپنے کو زیادہ سے زیادہ معتدل ثابت کرکے باقی غیر جانبدار دنیا میں مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور کرتا رہیگا۔ اسی طرح ہر ایک کو لازم ہوگا کہ جو سرمایہ دار ہے، وہ زیادہ سے زیادہ اُن خرابیوں کی اصلاح کرے جو سرمایہ داری کے ساتھ وابستہ ہیں اور جو اشتراکیت کا علمبردار ہے وہ زیادہ سے زیادہ اُن کمیوں کو دور کرے جو اشتراکیت کی انتہاء کا نتیجہ ہیں اور اُن دونوں کے پیچھے ہٹتے ہوئے قدم دونوں ہی کو اس مشترک منزل پر گلے ملنے میں مدد دے رہے ہیں جو اسلام سے انہیں قریب سے قریب تر کر سکتی ہے۔

(۹)

مادی نقطۂ نظر انسانی سفر کا آغاز دورِ وحشت سے بتاتا ہے جہاں ہر فرد کی دنیا الگ ہوتی ہے۔ پھر اجتماعی زندگی کا احساس پیدا ہوا تو گھر بنے اور گھروں سے مل کر گھرانے بنے اور گھرانوں سے مل مل کر قبیلے بنے اور قبیلے متحد ہو کر ملک بنے اور کئی کئی ملکوں کو ملا کر شہنشاہتیں قائم ہوئیں۔ اس طرح رفتار ارتقاء انسانی کی صاف اس سمت کا پتہ دے رہی ہے کہ کثرتیں مٹ مٹ کر وحدتوں میں تبدیل ہوں، اب موجودہ دور میں رفتار ترقی یہاں تک پہنچی ہے کہ تمام دنیا دو نقطوں پر بٹ گئی ہے، مشرق اور مغرب۔ اب مسائل پر یوں غور ہوتا ہے کہ کون چیز ایشیاء کے لیے زیادہ مفید ہے اور کون یورپ کے لیے؟ اب اس کے بعد کا قدم صرف یہ ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک ہو جائیں جس کے لیے قرآن نے پہلے ہی دن یہ کہا تھا کہ للہ المشرق والمغرب۔ یہ مشرق و مغرب کا اختلاف کیسا۔ مشرق اور مغرب دونوں اللہ کے ہیں۔ اس طرح ارتقاءِ انسانی کا آخری نقطہ جس تک اب بلا فاصلہ دنیا جا سکتی ہے۔ وہ یہی ہے کہ خدا کی وحدت کے رشتہ سے تمام دنیا آپس میں یگانگی محسوس کرے اور وہ دن ہو سکتا ہے کہ جب لیظہرہ علی الدین کلہ کا قرآنی وعدہ پورا ہو اور تمام دنیا قاف سے تا قاف اسلامی پرچم کے نیچے متحد نظر آ رہی ہو۔

(۱۰)

سب سے آخر میں رہنمایانِ اسلام کی زندگیوں کی پاکیزگی اور بلندی ہے۔ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق و تعلیمات، حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی زندگی اور بالخصوص دورِ خلافت کی سادگی اور مساوات پسندی اور انسانیت پروری حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی بے نظیر قربانی اور دیگر ائمہ طاہرین علیہم السلام اور ان تمام حضرات کے سچے پیروں کی زندگی کے نمونے۔ ان سب کو مذہبی اصطلاحات کا بوجھ ڈالے بغیر جو دوسرے افراد کو اجنبیت محسوس کرنے کا باعث ہوتے ہیں اور معجزات وغیرہ کے تذکرہ سے الگ کر کے موجودہ ذہن کو غور و فکر کے جادہ سے ہٹا دیتا

ہے صرف اخلاقی اور انسانی نقطۂ نظر سے اگر پیش کیا جائے اور یہ کام بحمد اللہ کچھ اللہ کے بندوں کے ہاتھ سے شروع ہوگیا ہے اور عادات و رسوم کی زلف گرہ گیر کے اسیر اس کی کتنی ہی مخالفت کریں لیکن دنیائے حاضر کے تقاضوں کے لحاظ سے اس کے بحیثیت نتیجہ اصلح ہونے کی وجہ سے یہ کام آگے بڑھتا ہی جائے گا قدم پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دنیا کے موجودہ ترقی یافتہ ذرائع نشر و اشاعت سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر جتنا اس کام کو آگے بڑھایا جائے گا اُن اخلاقی تعلیمات اور سیرت کے بے نظیر مرقعوں کی جاذبیت دنیا کو اس مرکز کی طرف کشاں کشاں لانے کی باعث ہے اور آخر میں اُس اسلام حقیقی پر دنیا کو مجتمع ہونا ہے جس کی یہ ہستیاں عملی مجسمہ تھیں۔

---

تلک عشرۃ کاملہ - سردست یہ دس پہلو مجملا پیش کر دیئے گئے ہیں جنھیں اگر پھیلا کر لکھا جائے تو اس موضوع پر کافی ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

(والسلام)

# قانون شریعت اسلامی میں ترمیم کے بارے میں ہمارا نظریہ

ہندوستان میں جب سے ملکی حکومت برسرِ اقتدار آئی ہے، وقتاً فوقتاً اسلامی شریعت میں ترمیم کی تجویز سامنے آتی رہتی ہے اور ادھر چند سال سے اس میں قوت اور شدت پیدا ہوگئی ہے جس میں مسلم ممالک میں بنام اصلاحات و ترقیات نافذ شدہ ترمیمات کی نظیر پیش کی جاتی ہے ضرورت کا احساس اور بعض حضرات کی فرمائش محرک ہو رہی ہے کہ میں شیعی نقطۂ نظر کو اس سلسلہ میں پیش کر دوں جو مختصراً درج ذیل ہے۔

ہمارے نزدیک جواز روئے قرآن و حدیث ثابت ہے اور عقل سلیم بھی اس پر مہر تصدیق ثبت کیے ہوئے ہے، وہ یہ ہے کہ قانون شریعت کا واضع خداوند عالم ہے خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی واضع قانون کی حیثیت حاصل نہیں ہے بلکہ آپ مبلغ قانون تھے:۔

وَلَقَدْ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعِ السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ

اس طرح حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی متبع ہیں۔ معاذ اللہ متبوع نہیں ہیں (ان اتبع الا ما یوحی الیّ) اور مسلمانوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ رسولؐ کا اتباع کریں۔ (قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی) اور رسولؐ کے اتباع کے معنی ہیں اُس قانون کا اتباع جو اُن کے ساتھ آیا ہے (فالذین اٰمنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولٰئک ھم المفلحون) یہ نور جو آپ کے ساتھ آیا ہے اُنہی احکام کا ہے جو قانونِ شریعت کی صورت میں آپ کے ذریعہ سے نافذ ہیں اور جن کے ذریعہ سے سابقہ شریعتوں کو منسوخ کیا گیا ہے (یضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم) اور یہ اتباع اُس ایمان کا جو پہلے نمبر پر آیا ہے ایک عملی تقاضا ہے اور اس اتباع کے خلاف راستہ اختیار کرنا اور اُس قانون کے دفعات میں ترمیم کرنا رسول اللہ صلعم کے مقابلہ میں مشاقہ ہے جسے غیر سبیل المومنین کہتے ہوئے اس پر وعید عذاب کیا گیا ہے (ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدی ویتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولّی ونصلہ جھنم وساءت مصیرا)

چوں کہ ایمان بالرسالہ کسی ایک دور سے مخصوص نہیں اس لیے شریعت رسولؐ سے کسی دور میں بھی مسلمانوں کو انحراف جائز نہیں ہو سکتا (لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلاً)

ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا )

بے شک پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے تبلیغ احکام بمقتضائے اسباب و ظروف تدریجی طور پر ہوئی اس لیے کچھ احکام شرعی نصوص کے تحت میں عام مسلمانوں کو معلوم ہوئے اور کچھ جن کی تبلیغ کے مواقع آپ کے سامنے نہیں آئے، ان کے لیے منظور خالق یہ ہوا کہ وہ آپ کے نائبین خاص کے پاس مخزون ہوں جو اولی الامر ہیں تاکہ وہ بمقتضائے محل ان کی تبلیغ فرماتے رہیں اور اس لیے جب بحکم الٰہی ( بلغ ما انزل الیک من ربک ) اس سلسلہ کی پہلی کڑی کا اعلان ملأ عام میں اور اس طرح قیامت تک کی ہدایت کا سامان ہوگیا تو تکمیل دین کا بھی اعلان آگیا ) الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً )

اس طرح ائمہ معصومین علیہم السلام نے بھی جو احکام شرع بیان کیے وہ بتوسط رسول احکام الٰہی کی ترجمانی ہی کی حیثیت رکھتے تھے نہ یہ کہ وہ معاذ اللہ خود احکام تراشتے اور قوانین بناتے تھے۔

پھر جب کہ نظام زندگی کے احکام و قوانین بنانے کا اختیار ہمارے نزدیک پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے معصوم نائبین علیہم السلام کو نہیں تو کسی جائز الخطا انسان کو وضع قوانین و احکام کا حق کس طرح ہو سکتا ہے۔

جو اس طرح کا حکم قرار دیا جائیگا وہ بدعت کا مصداق ہوگا جس کے لیے حدیث ہے کل بدعۃ ضلالۃ و کل ضلالۃ فی النار۔

ہمارے نزدیک بدعت کسی نئے کام کو نہیں کہتے بلکہ شریعت میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ ہی کو کہتے ہیں۔ خواہ بصورت اضافہ ہو خواہ بصورت کمی اور خواہ بصورت تبدیلی۔

بے شک ہمارے نزدیک "اجتہاد" کا دروازہ کھلا ہوا ہے مگر اجتہاد کے معنی تحصیل حکم شرعی کی کوشش کے ہیں نہ کہ تشکیل حکم شرعی کی کاوش۔

اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ اگرچہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے نائبین کے ذریعہ سے زندگی کے مکمل قانون کی تبلیغ ہو گئی تھی مگر اس کے بعض جزئیات امتداد زمانہ سے

ہم تک نہیں پہونچ سکے۔ اس طرح کثیر التعداد احکام تو نصوص سے ثابت ہیں مگر کچھ احکام کے بارے میں تلاش سے نصوص دستیاب نہیں ہوتے۔

جو احکام نصوص سے ثابت ہو جائیں، اُن میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں، اس لیے ہمارا قطعی طور پر مسلّمہ ہے کہ "اجتہاد فی مقابلۃ النّص" حرام ہے۔

ہاں ان ادلّۂ شرعیہ کی دلالت میں اگر کوئی علمی پیچیدگی ہو جیسے بعض الفاظ مشترک ہوتے ہیں، ان میں معانی کی تعیین قرائن سے ہوتی ہے یا الفاظ کے مجازی معنیٰ پر محمول ہونیکا قرائن کی بنا پر امکان معلوم ہوتا ہو یا عمومات ہوں جن کی تخصیص کا احتمال ہو یا اطلاق ہو اور اسمیں قیود ثابت ہونے کے کچھ وجوہ محسوس ہوتے ہوں تو ان میں معانی کی تعیین کے لیے اجتہاد کی گنجائش ہے۔

بعض جگہ نصوص مختلف نظر آتے ہیں تو ان میں جمع یا ترجیح کے لیے اجتہاد ہوتا ہے یا وہ چیزیں جن میں نص ہم تک پہونچا نہیں تو اُن قواعد شرعیہ یا اصول عملیہ کو دیکھنا ہوتا ہے جو ازروئے شرع عمومی طور پر ثابت ہوئے ہیں اور اب سمجھنا ہوتا ہے کہ یہ محل ان میں سے کس قاعدہ یا اصل کے تحت میں داخل ہوتا ہے۔

یہ اجتہاد کی ضرورت ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور اس کا دروازہ بند نہیں ہو سکتا مگر جیسا کہ پہلے لکھا گیا اس کی حیثیت تحصیل حکم شرعی کی کوشش ہی تک محدود رہ سکتی ہے۔ کسی حکم ثابت شدہ میں ترمیم یا کسی نئے حکم کی تشکیل کا دروازہ وحی کے دروازہ کے بند ہونے کے ساتھ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے اور اس کا حق نہ کسی ایک مسلمان کو ہے اور نہ تمام مسلمانوں کو مل کر ہے اور نہ کسی بھی حکومت کو ہے خواہ وہ مسلمانوں کی حکومت ہو اور جو اس قسم کی بات کہیں بھی ہوئی ہو، خواہ وہ مسلم حکومتوں کی جانب سے ہو، وہ ہمارے نزدیک اسلام کے خلاف ہے۔ والسلام،

# خدا اور مذہب

(لارڈ رسل کے خیالات کا منطقی جائزہ)

میرے ہندوستانی مخلص احباب میں جو تقسیم ہند کے بعد پاکستانی ہو گئے ایک سید ظہور الحسن صاحب نقوی ایم، اے (رسول نگر ضلع گجرانوالہ پنجاب ہیں) انہوں نے کافی دن ہوئے کہ ایک انگریز مشہور مصنّف لارڈ رسل کی کتاب "تاریخ فلسفۂ مغرب" دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ شدت سے منکر خدا ہیں تو انہوں نے خط و کتابت سے اُن کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنا چاہا۔ ان کے خط کے جواب میں لارڈ رسل نے لکھا کہ "میری کتاب" میں کیوں نصرانی نہیں ہوں"؟ پڑھ لیجئے"۔ اس بنا پر سید صاحب نے وہ کتاب خریدی اور اُس کے کچھ مضامین کا خلاصہ تبصرہ کے لیے میرے پاس بھیج دیا۔

چنانچہ ذیل میں لارڈ رسل کے کچھ فرمودات پر مجملاً منطقی تبصرہ کیا جاتا ہے۔

سید صاحب یا کوئی اور صاحب اصل انگریزی کے اقتباسات دے کر میرے معروضات کی روشنی میں انگریزی ہی میں اُس پر ریویو فی الجملہ تفصیل کے ساتھ لکھ دیں تو میری اس کاوش قلمی کا کچھ ماحصل ہو سکتا ہے۔ والسلام۔

علی نقی النقوی

۲ رجادی الثانی ۱۳۹۰ھ (علی گڑھ)

لارڈ رسل کے نام کے ساتھ داوین (" ") کے بعد اُن کا کلام ہے اور اس کے ختم ہونے پر دوسرے داوین (' ') کے بعد جو ہے وہ میرا تبصرہ ہے۔

(۱)

# لارڈ رسل :-

"میں تمام ادیان عالم یعنی بدھ مت ۔ ہندو مت، نصرانیت اور اسلام کو جھوٹا اور نقصان دہ سمجھتا ہوں ۔ نہایت آسان اور قابل فہم منطق یہ ہے کہ چوں کہ یہ سب ادیان آپس میں شدید اصولی اختلاف رکھتے ہیں ۔ اس لیے ان میں سے ایک بھی سچا نہیں ۔"

جس منطق کو بہت آسان اور قابل فہم کہا جا رہا ہے اس کے لیے یہ منطقی بات کیا غور کے قابل نہیں ہے کہ آپس میں شدید اصولی اختلاف رکھنا اس پہ تو دلالت یقیناً کرتا ہے کہ یہ تمام ادیان ایک ساتھ حق نہیں ہیں لیکن ان میں سے ایک حق ہو اور باقی باطل ہوں تو اس صورت میں لازماً کیا اختلاف نہ ہوگا؟

پھر جب کہ اختلاف ہونے کی صورت میں عقلاً دونوں صورتیں ممکن ہیں ۔ یہ بھی کہ سب باطل ہوں اور یہ بھی کہ ایک حق ہو اور باقی باطل ہوں یعنی وجود اختلاف عام ہے اور باطل ہونا تمام کا (بلا استثناء) خاص ہے کیونکہ اختلاف کی صورت کی یہ ایک ممکن شکل ہے جس کے ساتھ دوسری شکل بھی موجود ہے کہ ایک ان میں سے حق ہو اور باقی باطل ہوں اور منطقی طور پر یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ عام کی دلالت خاص پر نہیں ہوتی تو وجود اختلاف سب کے باطل ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا بلکہ اس اختلاف کے بعد عقلاً فکر و نظر اور تحقیق و تفتیش کی ضرورت ہے کہ ان میں سے کوئی ایک حق تو نہیں ہے اور اگر کوئی ایک حق ہے تو وہ اُن میں سے کون ہے؟

(۲)

رسل "صنعت تخلیق کی دلیل کو ڈاروِن نے پاش پاش کر دیا"

اوّل تو ڈاروِن کا پورا تصوّر صرف ظنّی اور تخمینی باتوں پر مبنی ہے جس کے لیے بلاوجہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ وہ مشاہدہ پر مبنی ہے حالاں کہ بعض کڑیاں اُس کی اب تک مشاہدہ میں نہیں آئیں اور اُن کی خانہ پری صرف خیال آرائیوں سے کی جاتی ہے۔

پھر یہ کہ ڈاروِن کے فلسفہ سے صرف تخلیق کے روایتی نظام میں شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے ہیں لیکن کائنات میں حکیم مطلق کا وجود جو ایک صانع حکیم کی ہستی کا پتہ دیتا ہے ڈاروِن کے خیالات سے بھی شکستہ نہیں ہوتا اور اسی لیے یورپ کے سائنس دانوں میں وجود خدا پر عقیدہ بڑھتا جاتا ہے، اگر وجود خدا کا قلعہ جیسا کہ رسل کا خیال ہے ڈاروِن نے پاش پاش کر دیا تو جوڈ وغیرہ جو ڈاروِن کے بعد پیدا ہوئے ہیں خدا کے وجود پہ کتابیں کیوں لکھ رہے ہیں۔؟

(۳)

رسل :- "میں کہتا ہوں کہ کیا ایک قادر و ناظر و کریم معبود جو اپنی بہترین مخلوق انسان کو لانے کے لیے لاکھوں سال تک کائنات کو سنوارتا اور سجاتا ہے، اس بات سے خوش ہو سکتا ہے کہ وہ انسان جب اپنے اوج کمال پر پہونچے اور ستاروں اور سیاروں پہ کمند ڈالنے لگے تو اس میں سے ہٹلر، [illegible] اور ہائیڈروجن بم پیدا ہوئے ؟"

اس میں متعدد تضاد اور گمراہیاں ہیں سب سے پہلے بہترین مخلوق ہونے کا [illegible] خیال میں شاید بہترین مخلوق کا معیار یہ تھا کہ انسان جبری طور پر اچھی صفات نیکی اور بھلائی کا پابند پیدا کیا گیا ہوتا تو پھر یہ انسان بہترین مخلوق ہوتا ہی کہاں؟ وہ تو ایک پتھر، گھانس، پھونس اور درخت، چرند و پرند، سب کی طرح کچھ خاص خواص اور بعض قانونوں کا غلام ہوتا، اُس کی بہتری تو اُس کے جوہر اختیار سے وابستہ ہے اور اسی اختیار کے جوہر کا محسوس ثبوت یہ ہے کہ اُس میں "موسیٰ" بھی ہوتا ہے اور فرعون بھی،

ابراہیم بھی اور نمرود بھی اور آخر میں ہٹلر اور اسٹالن بھی۔ اور خطا معاف لارڈ رسل بھی جو اس کے وجود کا انکار کر رہے ہیں اور میں بھی جو اُن کا جواب دے رہا ہوں۔

یہ کہ "کیا وہ اس سے خوش ہو سکتا ہے کہ ایسے اشخاص اُس میں پیدا ہوں"، اس کا جواب یہ ہے کہ خوش کبھی نہیں ہوتا بلکہ غضبناک ہوتا ہے مگر اس غضب کا اظہار اُس کی طاقتِ اختیار کے سلب کرنے سے نہیں ہوتا بلکہ انھیں موقع دینے سے ہوتا ہے کہ جتنا ان کا امکان ہے وہ شرارت اور شیطنت کر لیں، پھر وہ اُن کے عمل کی پاداش جو ہو وہ اُنھیں دیتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ مادی ترقی جس سے ہٹلر، اسٹالن اور ہائیڈروجن بم پیدا ہوئے ہیں انسان کا اوج کمال ہے ہی نہیں بلکہ انتہائی انحطاط ہے جو اس کے سوءِ اختیار کا نتیجہ ہے اوج کمال کا مظہر تو وہ افراد انسانی ہیں جو طاقت و اختیار رکھتے ہوئے عملاً فرشتہ رہے، اس لیے فرشتوں سے برتر ہو گئے۔

(۴)

رسل:- "کہا جاتا ہے کہ اس کائنات میں ہر چیز کا ایک سبب ہے۔ جب آپ پیچھے کو ہٹتے جائیں گے تو اسباب علل کا ایک زنجیرہ بن جائے گا اور آخر میں آپ خدا تک پہونچیں گے۔ تو خواہ مخواہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی علت کیا ہے؟ یعنی جب آپ کہتے ہیں مجھ کو خدا نے بنایا۔ پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ خدا کو کس نے بنایا؟ یہ سادہ سا سوال اس دلیل کے التباس کو واضح کر دیتا ہے۔"

یہ جسے چودہ سو برس کے ذہنی ارتقاء کے بعد لارڈ رسل سا شخص ایک منطقی سوال کی طرح سامنے لا رہا ہے، دورِ جاہلیت کے خوگر سادہ دماغوں کی طرف سے بطور ایک وسوسہ کے پہلی ہی صدی میں سامنے آ گیا تھا جس کا ذکر دوسری صدی میں تدوین شدہ صحیح مسلم کی کئی حدیثوں میں موجود ہے ـ مگر یہ سوال قطعاً بے بنیاد ثابت ہو گا جب یہ سمجھ لیجئے کہ اس میں علت اولی کی جو دلیل پیش کی گئی ہے اُس کے بنیادی جزء میں جو منطق کے لحاظ

«کبریٰ» کی حیثیت رکھتا ہے ایک ذرا سا مگر بہت بڑا تصرف کر دیا گیا ہے۔

وجودِ خدا کی دلیل کا مقدمہ یہ دیا گیا ہے کہ "اس کائنات میں ہر چیز کا ایک سبب ہے" اس جملہ میں "اس کائنات" کے بجائے اصلی دلیل میں "ممکنات" کی لفظ ہے یعنی جملہ یوں ہے کہ ممکنات میں ہر شے کا ایک سبب ہے" اور اس دلیل کا تتمہ یہ ہے کہ اس سلسلہ کو ختم ہونا چاہیے ایک ذات پر جو واجب الوجود ہو وہ واجب الوجود ذات خدا ہے۔

اب رسل صاحب کا سوال ختم ہو گیا۔ بے شک خدا کو بھی "ممکن" سمجھا جائے تو اس کے لیے بھی خالق کی ضرورت ہو گی مگر پھر وہ خدا ہو وے ہی گا کب؟ خدا تو نام اسی کا ہے جو واجب الوجود ہو اور جب واجب الوجود ہے یعنی بذاتِ خود موجود ہے، تو اس کے لیے علت سبب پیدا کرنے والے کا سوال اُٹھانا غلط ہے۔

(۵)

رسل:- "نظامِ کائنات میں نوامیس فطرت کارفرما ہیں۔ پھر خدا خود پابندِ قانون ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ نوامیس فطرت اوامر الٰہی سے خارج اور خدا سے ماقبل ہیں۔"

ظاہر ہے کہ ایک انسان کے مزاعم و خیالات خود اُس کے لیے دلیل نہیں بن سکتے۔ رسل نے نوامیس فطرت یعنی نظامِ عادت کو ناقابلِ تبدیل مان لیا تو یہ نتیجہ نکالا کہ خدا خود پابند قانون ہے۔ لیکن ہمارے سامنے واقعات ہیں کہ جہاں نوامیس فطرت شکستہ ہو گئے۔ آگ کا کام جلانا ہے مگر وہ نہیں جلاتی۔ پانی کا کام ڈبونا ہے مگر نہیں ڈبوتا۔ جسم انسانی کشش مرکز سے زمین کی طرف آتا ہے مگر ایک انسان ہے جو اس کشش کے حدود سے نکل کر فضائے بسیط کا سفر کرتا ہے اور پھر ارادۃً واپس آتا ہے اس لیے نوامیس فطرت کے نظام کو ہم کسی قانون گزار کا فعل ارادی ماننے پر مجبور ہیں، خدا اپنے نظامِ حکمت کے تقاضے سے عام طور پر ارادۃً قانون کو قائم رکھتا ہے مگر جب چاہتا ہے تو شکستہ بھی کر دیتا ہے تو قانون اُس کا پابند ہوا۔ وہ قانون کا پابند نہیں ہوا۔ اور اس لیے لازماً نوامیس فطرت اُس کے بعد ہیں۔ جس ذات کا نقطۂ ابتداء کوئی ہو ہی نہ۔

یعنی خدا - اس سے ماقبل کا تصور ہی کہاں ممکن ہے۔

(۶)

رسل :- "کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر چیز اس طرح خلق کی گئی ہے کہ ہم اس میں سہولت سے بسر کرسکیں اور اگر یہ ذرا مختلف ہوتی تو ہم اس طرح نہ رہ سکتے۔ مگر ڈاروِن کے وقت سے ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ زندہ مخلوق اپنے ماحول میں ڈھل جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ ماحول ان کے مناسب حال بنا دیا جاتا ہے بلکہ وہ ماحول کے مطابق ہو جاتی ہے"

اگر یہ بات کلیتہً ٹھیک مانی جائے تو مچھلی کو پانی کے باہر آکر مرنا نہیں چاہیئے اور انسان کو پانی کے اندر جاکر ڈوبنا نہیں چاہیئے بلکہ ہر ایک اپنے کو ماحول کے مطابق بنائے اگر ایسا ہوتا تو ہم مان سکتے کہ پانی نہ ہوتا، ہوا نہ ہوتی تو بھی زندہ مخلوق کسی نہ کسی طرح اپنے کو ماحول کے مطابق ڈھال لیتا۔ پھر معلوم نہیں سیارات پر جانے والوں کو یہ فکر کیوں ہے کہ وہاں بغیر ہوا کے زندہ کیونکر رہیں گے؟ لہذا ہوا کا ذخیرہ اپنے ساتھ لے جانا چاہیئے۔

یہ مشاہدہ تو بتلاتا ہے کہ بسر کرنے کے سامان پہلے مہیا ہوتے ہیں۔ تب اُن ضروریات کی محتاج مخلوق وہاں لائی جاتی ہے۔

(۷)

رسل :- "پروفیسر کانٹ نے مذکورۂ بالا ہر سہ دلیل کو بالکل قطع کر دیا مگر ایک نئی دلیل وجود خالق پر ایجاد کردی اور وہ اخلاقی دلیل ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں"

قطع نظر اس سے کہ کانٹ نے مذکورۂ بالا دلیلوں کی رد جو کی وہ درست ہے یا نہیں اور جو خود اپنی دلیل قائم کی وہ مستحکم ہے یا نہیں جناب رسل نے اُس کی رد میں جو کہا ہے، اس کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

رسل :- "کانٹ کا کہنا ہے کہ اچھے اور بُرے کا کوئی انجام ہونا چاہیئے

اس کے لیے روز آخرت کی ضرورت ہے اور آخرت کا فیصلہ بغیر خدا کے وجود کے نہیں ہو سکتا
مگر ہم کہتے ہیں کہ جب دنیا میں عدل نہیں تو آخرت میں عدل کہاں ہو گا"
جناب رسل نے جواب میں جو طریقہ اختیار کیا ہے اسے منطق میں تمثیل کہتے ہیں اور فقہ میں "قیاس"
اس سے ہمیشہ گمان پیدا ہوتا ہے جو بہت دفعہ غلط ہوتا ہے۔

پھر قیاس مع الفارق تو سب ہی کے نزدیک غلط ہے۔ دنیا جب عمل کا میدان قرار دی گئی ہے تو اس میں اچھے بُرے سب کو ہر طرح کی آسانیاں ہونا ہی چاہئیں۔ آخرت کا جو منزل جزا و سزا ہے اس پر قیاس کہاں درست ہو سکتا ہے؟ یہ ایسا ہے جیسے کہا جائے کہ جب امتحان کے کمرے میں قابل اور نا قابل کا کوئی فرق نہیں اور سب کے لیے یکساں طور پر آسانیاں ہیں تو بھلا نتیجہ میں فرق کہاں ہو سکتا ہے؟ کیا یہ منطق مضحکہ خیز نہیں ہے؟

یاد رکھنا چاہیئے کہ آخرت میں عدالت ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ اس دُنیا میں اُن لوگوں کو جو بڑے سے بڑے جرائم کے ارتکاب کے جراثیم رکھتے ہیں پورا پورا موقع نہ دیا جائے کہ وہ جو کرنا چاہیں کر سکیں۔

(۸)

لارڈ رسل انبیاء و مرسلین اور رہنمایان دین کا امی اور (معاذ اللہ) جاہل کہہ کر استخفاف کرتے ہیں حالاں کہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح وجود ممکنات کے سلسلہ کو ایک واجب الوجود تک منتہی ماننا ضروری ہے (چاہے رسل اُسے نہ مانیں) اسی طرح "علم" اگر واقعی علم ہے تو اسے آخر میں "علم وہبی" پر منتہی ماننا لازم ہے۔ انبیاء اسی علم وہبی کے حامل ہوتے تھے جس کے نتیجہ میں دنیا ہر صحیح علم میں پھر نظر و اکتساب سے آگے بڑھی۔

اگر صرف کتابوں کا پڑھنا معیار علم ہے تو وہ مصنفین جن کے تصانیف نصاب درس میں داخل ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ ان تصانیف کو پڑھے ہوئے نہ تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے وہ جاہل تھے مگر انہوں نے ایسی کتابیں لکھ دیں جن کو پڑھ کر لوگ آج عالم بنتے ہیں۔

ایسے ہی انبیاء دنیا کی کتابوں کے علم کو پڑھ کر عالم نہیں بنا کرتے تھے مگر اُن کے ذریعہ سے

دنیا میں بے شمار علمار پیدا ہو گئے۔

(۹)

رسل:۔ "ہماری علمی دُنیا میں یہ رجحان ہے کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ مذہبی تعلیم سچی ہے یا نہیں، دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ تعلیم مفید ہے یا نہیں"۔

یہ دنیا جسے علمی دنیا کہا گیا ہے اگر کوئی جاہلانہ رجحان قائم کرے تو وہ صرف اس لیے کہ "علمی دنیا"، کی طرف نسبت رکھتا ہے صحیح تو نہیں ہو جائے گا۔ فائدہ اور نقصان کے اقدار ذہنیت کے لحاظ سے بدلتے ہیں یوں تو ایک ڈاکو کے نزدیک، وہ کاروبار بہت مفید ہے مگر اخلاق کے نقطۂ نظر سے وہ انتہائی تباہ کن ہے، ویسے ہی یہ خیال کہ کوئی عقیدہ غلط بھی ہو تو اس کی غلطی میں کوئی حرج نہیں جب کہ وہ مفید ہو"۔

علم کا فیصلہ حقیقتہً یہ ہے کہ ذہنی گمراہی یعنی غلطیات کا ماننا خود ہی بہت بڑا نقصان ہے۔

اگر رسل صاحب کے پیمانہ پر ناپا جائے تو الٰہیات ہی نہیں بلکہ ریاضی اور فلسفہ اور تاریخ کے کلاسوں کو بھی یونیورسٹیوں سے توڑ دینا چاہیئے اس لیے کہ اس میں نقصان ہی کیا ہوتا ہے کہ دو اور دو کے مجموعہ کو پانچ مان لیا جائے۔ اور اس سمجھنے میں بھلا افادیت ہی کیا ہے کہ اہرام مصر کے بانی کون لوگ تھے؟ اور اس سمجھنے سے فائدہ ہی کیا ہوگا کہ اشوک کا زمانۂ حکومت قبل مسیح تھا یا بعد مسیح وغیرہ وغیرہ۔

یہ تصور اگر علمی دنیا کی اُن سرگرمیوں سے جو ان فنوں میں ہو رہی ہیں غلط ثابت ہوتا ہے تو مذہب پر بھی یہ اعتراض کہ عقائد کتنے ہی غلط ہوں بس یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ مفید ہیں یا نہیں، غلط قرار پانا چاہیئے۔

(تمام شد)

PRINTED AT
THE ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY PRESS, ALIGARH, 1971